وزیرستان معاشرہ اور تحکیم پر مبنی وزیری رسم ورواج
ایک تحقیقی جائزہ

Waziristan Society and Waziri Traditions: An Analysis

☆ تاج محمد

ABSTRACT:

In the tribal areas of Pakistan, including Waziristan, there is no rule of law as prescribed in other parts of the country. However, there are certain traditions and customs whereby an individual or tribes may get justice. In Waziristan area, people follow a traditional law consisting of 30 codes known as "Waziri Traditions". These traditional codes formed the basis of settling disputes and deciding controversial cases for the last 500 years. One of the characteristic features of this code of law is its flexibility that has enabled it to work, of course, with slight modification and interpretation of some justifiable decisions. Another appreciable feature of this code is selection of arbitrator to hear the disputes and decide in accordance with the Waziri code. This paper analyzes whether the Waziri code is in consonance with the Islamic legal system and what place the arbitrator occupies in that system.

وزیرستان:

وزیرستان کا مطلب ہے وزیر قبیلے کا دیس یعنی وہ علاقہ جہاں وزیر قبیلہ آباد ہے۔اس علاقے میں اگرچہ محسود، داوڑ، سلیمان خیل، دوتانی اور برکی جیسے مختلف چھوٹے بڑے دیگر قبیلے بھی آباد ہیں لیکن چونکہ غالب

☆ ریسرچ سکالر Ph.D، ڈیپارٹمنٹ آف عربک، اسلامک سٹڈیز اینڈ ریسرچ، گومل یونیورسٹی ڈیرہ اسماعیل خان۔

اکثریت اتمان زئی وزیر اور احمد زئی وزیر قبائل کی ہے اس لیے اس پورے علاقے کو مؤرخین نے وزیرستان کے نام سے موسوم کر دیا ہے۔(۱) یہ علاقہ گرین وچ سے مشرق کی جانب ۶۹۔۷۰ درجے طول البلد اور خط استواء سے شمال کی جانب ۳۲۔۳۳ درجے عرض البلد پر واقع ہے۔(۲) ۱۸۹۶ء میں حکومت برطانیہ نے ظاہری طور پر انتظامی نظم و نسق کے نام سے لیکن در حقیقت اپنے استحصالی مقاصد کی تکمیل کیلئے اسے شمالی اور جنوبی وزیرستان کے نام سے دو ایجنسیوں میں تقسیم کر دیا۔(۳) وزیرستان کا کل رقبہ ۱۱۳۲۶ کلومیٹر ہے جو فاٹا کے کل رقبے کا ۵۰ فیصد بنتا ہے۔(۴) ۹۸۔۱۹۹۷ء کی غیر تسلی بخش مردم شماری کے مطابق کل وزیرستان کی آبادی ۷۱۷۵۹ نفوس پر مشتمل ہے جو فاٹا کی کل آبادی کا ۲۵ فیصد حصہ بنتی ہے۔(۵) وزیرستان کے مغرب میں افغانستان، جنوب میں پاکستان کا ضلع ژوب، مشرق میں ضلع بنوں اور ضلع ڈیرہ اسماعیل خان اور شمال میں ضلع کوہاٹ اور کرم ایجنسی واقع ہیں۔ جنوبی وزیرستان کا صدر مقام وانا پھلوں اور سبزیوں کیلئے پورے ملک میں مشہور ہے۔(۶)

تحکیم کے لغوی معنی:

یہ لفظ باب تفعیل سے مصدر کا صیغہ ہے حَكَّمَ يُحَكِّمُ تَحْكِيمًا، جس کے معنی ہیں کسی کو ثالث بنانا یا کسی مقدمے کو ثالثی کے ذریعے سے حل کرانا۔ ثلاثی مجرد سے یہ حَكَمَ يَحْكُمُ حُكْمًا و حَكُومَةً آتا ہے جس کے معنی ہیں روکنا۔ اس معنی کی مناسبت سے حکومت کو اس لیے حکومت کہا جاتا ہے کہ وہ رعیت کے درمیان ظلم و جور کو طاقت کے ذریعے روکتی ہے۔ ثالثی کرنے والے کو عربی میں حَكَمُ اور مُحَكَّمُ کہتے ہیں کیونکہ وہ فریقین کے درمیان فیصلہ کر کے انہیں ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے روکتا ہے۔(۷) یہ الگ بات ہے کہ ثالث یا حَكَم کو فریقین ہی کوئی معاملہ حل کرانے کیلئے منتخب کرتے ہیں البتہ اس کے پاس قاضی یا جج جیسے اختیارات نہیں ہوتے اس لیے ثالث اپنا فیصلہ طاقت کے ذریعے نافذ نہیں کرا سکتا۔(۸)

رسم و رواج کے لغوی معنی:

رَسْمٌ کا لفظ باب نَصَرَ يَنْصُرُ سے عربی زبان میں مصدر کا صیغہ ہے اور اس کے معنی ہیں نشان یا زمین بوس گھر کے کچھ بقیہ نشان۔(۹) اردو زبان میں منتقل ہونے کے بعد اس کے حقیقی معنی نشان، نقش اور تحریر کرنے کے اور مجازی معنی دستور، قاعدہ، آئین اور قانون کے آتے ہیں۔(۱۰) نیز یہ لفظ لکھنے، خاکہ بنانے، سکیم اور علامت کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔(۱۱) رواج بھی باب نَصَرَ يَنْصُرُ سے رَاجَ يَرُوْجُ رِوَاجًا مصدر کا

صیغہ ہے۔ اصل میں رَوَجَ یَرْوُجُ تھا، اعلال کے بعد رَاجَ یَرُوْجُ بنا۔ رَاجَ الاَمْرُرَوْجًا و رِوَاجًا کے معنی ہیں جب کسی کام میں چالو ہونے کے بعد تیزی آئے۔(۱۲) اردو لغت میں اس کے معنی ریت، رسم، قاعدہ، قانون، ضابطہ، دستور اور معمول عام طریقے کے آتے ہیں۔(۱۳) اس سے واضح ہوا کہ اردو زبان میں یہ دونوں لفظ مترادف ہیں۔ یہ دونوں لفظ اگرچہ اصل کے لحاظ سے عربی زبان کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں لیکن عصر حاضر میں عربی زبان میں یہ تقریباً متروک الاستعمال ہیں اور ان کی جگہ عرف و عادت کے الفاظ مستعمل ہیں جو تقریباً ان کے ہم معنی ہیں اس لیے ضمنی طور پر یہاں اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ رسم ورواج کے ہم معنی الفاظ یعنی عرف و عادت کی توضیح وتشریح کی جائے تاکہ قاری کو آگے بڑھتے ہوئے آئندہ مباحث میں ان الفاظ کے مفاہیم کے تعین میں دقت کا سامنا نہ ہو۔

عرف کی لغوی تحقیق :

• عُرْفٌ مصدر کا صیغہ ہے، باب ضَرَبَ یَضْرِبُ ثلاثی مجرد سے عَرَفَ یَعْرِفُ کے معنی ہیں پہچاننا، جان لینا۔(۱۴)

• باب نَصَرَ یَنْصُرُ سے کسی قوم کے چودھری بننے اور اس کی معاملات کے انتظام کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی معنی کی مناسبت سے عُرْفُ الشَرْعِ شرعی قانون کو کہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عرب غیر قانونی فیصلے یا ثالثی کو "حکم عرفی" کہتے ہیں۔(۱۵) ابن منظور نے عرف اور اس کے متعلقات کی تشریح وتوضیح کچھ یوں کی ہے، العرف ضد النکر وھو کل ما تعرفہ النفس من الخیر و تبسأ بہ و تطمئن الیہ۔" عرف نکر کی ضد ہے، اس کا اطلاق ہر اس امر پر ہوتا ہے جس کو انسانی ذہن اچھا سمجھے، اس کے کرنے پر داد دے اور اس پر مطمئن ہو جائے۔" اسی سے لفظ معروف مشتق ہے جس کا مفہوم ہے اسم جامع لکل ما عرف من طاعۃ اللہ والتقرب الیہ والاحسان الی الناس۔ "ان تمام افعال واقوال پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی اطاعت کے ہوتے ہیں، جن سے قرب خداوندی حاصل ہوتی ہے اور جن میں انسانوں کے ساتھ بھلائی کا پہلو موجود ہوتا ہے۔" کاہن کو عربی میں عرّاف کہتے ہیں اسلئے کہ وہ غیبی امور جاننے کا دعویدار ہوتا ہے۔ سردار کو اس لیے عریف کہا جاتا ہے کیونکہ وہ قوم کے جذبات اور احساسات سے باخبر ہوتا ہے اور یہی معنی حضرت ابن عباسؓ کے اس قول کے ہیں کہ اَھْلُ الْقُرْآنِ عُرَفَاءُ اَھْلِ الْجَنَّۃِ یعنی قرآن کا علم رکھنے والے جنتیوں کے سردار ہونگے۔

چہرے کے خدوخال کو اسی مناسبت سے معارف کہتے ہیں کیونکہ ان ہی کے ذریعے سے انسان کی پہچان ہوتی ہے۔ عرفات کی وجہ تسمیہ میں یہی معنی معتبر ہے کیونکہ یہاں لوگ باہمی طور پر متعارف ہوتے ہیں۔[۱۶]

عرف کی اصطلاحی تعریف وتشریح:

عرف کی اصطلاحی تعریف کے سلسلے میں اصول فقہ کے ماہرین کی عبارات اگر چہ مختلف ہیں لیکن ان کا مفہوم تقریباً ایک ہے۔ ذیل میں چند جلیل القدر علماء کے اقوال ذکر کیے جاتے ہیں تاکہ اُن کی روشنی میں ''عرف'' کا ایک جامع اور وسیع مفہوم سامنے آسکے۔

العرف عادة جمهورالقوم فی قول او عمل۔[۱۷]

''قول یا عمل میں جمہور یعنی اکثریت کی عادت کا نام عرف ہے''۔

العرف ما اعتاده الناس من معاملات واستقامت علیه امور هم۔[۱۸]

''عرف وہ طریقہ ہے جس پر لوگ عمل کرنے کے عادی ہو چکے ہوں اور اس پر اُن کی زندگی کے معاملات قائم ہوں''۔

هو عادة جمهورفی قول او عمل ویشترط فیه ان یکون منتشرا بین اکثرالناس فی الامور التی تحتاج الی التفکیر۔[۱۹]

''کسی قول یا عمل میں جمہور کی ایسی عادت جو اکثر لوگوں میں جاری ہو اور ایسے امور سے اُن کا تعلق ہو جو فکر کے محتاج ہوتے ہیں''۔

العرف مایتعارفه الناس ویسیرون علیه من قول او فعل۔[۲۰]

''عرف سے مراد وہ طریقہ جو لوگوں کے درمیان متعارف ہو اور قولی یا عملی طور پر لوگ اس پر چلتے ہوں''۔

یطلق العرف ماتعارف علیه الناس و اعتادوه من قول او فعل لا یخالف نصا من کتاب او سنة۔[۲۱]

''عرف سے مراد وہ طریقہ جس سے لوگ متعارف ہوں، قولی یا عملی طور پر اس کے عادی ہوں اور وہ قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو''

الغرض ماہرین فن کی مذکورہ مختلف تعریفات کو مدنظر رکھتے ہوئے بطور خلاصہ عرف کی تعریف یوں کی جا

سکتی ہے۔

''انسانی معاشرے کے ہر دور میں کسی علاقے کے باشندوں کی اکثریت کا ایسا پسندیدہ طرز عمل جو اُن کے درمیان جاری وساری ہو اور قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو''۔

عادت کے لغوی معنی:

عربی عبارات میں عموماً ''عرف'' کے ساتھ ''عادت'' کا لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اسلئے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عُرف کے ساتھ لفظ ''عادت'' کی بھی وضاحت کی جائے تاکہ قاری بصیرت کے ساتھ آگے بڑھ سکے۔ یہ لفظ بھی مصدر ہے، باب نَصَرَ یَنْصُرُ سے عَوَدَ یَعُوْدُ آتا ہے جو اعلال کے بعد عَادَ یَعُوْدُ بنا۔ اس کے معنی لوٹنے یا دوبارہ آنے کے ہیں۔ عادت کی جمع عادات اور عوائد آتا ہے اور مجازی معنی میں یہ لفظ رسم ورواج کے لیے مستعمل ہوتا ہے۔(۲۲)

نیز العادة ما یعتاده الانسان ای یعود الیه مرارمتکررة۔(۲۳)

''عادت وہ عمل ہوتا ہے جس کی انسان کو عادت پڑ جاتی ہے یعنی وہ اس کو بار بار کرتا ہے''۔

اسی بنیاد پر اہل لغت نے عادت کے معنی طور طریقہ، چال چلن، دستور اور قاعدے کے الفاظ سے کیا کیونکہ ان تمام امور کے مفہوم میں تکرار کا عمل دخل ہوتا ہے۔ اسی معنی کے لحاظ سے عید کو عید کہا جاتا ہے کیونکہ مسلمانوں پر خوشی کا یہ موقع بار بار آتا ہے۔(۲۴)

عادت کے اصطلاحی معنی:

علم اصول فقہ کے ماہرین نے اس سلسلے میں جو کچھ تحریر فرمایا ہے ان میں سے چند چیدہ چیدہ عبارات کچھ یوں ہیں۔

العادة عبارة عما یستقر فی النفوس من الامور المتکررة المقبولة عند الطباع السلیمة۔(۲۵)

''عادت وہ کیفیت ہے جو کسی عمل کے بار بار دہرانے سے ذہن میں گھر کر جائے اور سلیم الفطرت طبیعتوں کیلئے قابل قبول ہو''۔

العادة ما خوذة من المعاودة فهی بتکررها ومعاودتها مرة بعد اخری صارت معروفة

مستقرة فی النفوس والعقول متلقاة بالقبول من غیر علاقة حتی صارت حقیقة۔[۲۶]

''عادت کا لفظ معاودۃ یعنی بار بار لوٹنے سے ماخوذ ہے اور بار بار کرنے سے ایک فعل جانا پہچانا بن جاتا ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں بغیر کسی علاقہ اور عقلی قرینہ کے جاگزیں ہو کر قابل قبول بن جاتا ہے''۔ جناب ساجد الرحمان صدیقی صاحب لکھتے ہیں:

> ''عادت کا اصطلاحی مفہوم بڑا وسیع ہے اور اس کا اطلاق مندرجہ ذیل پہلوں پر ہوسکتا ہے
>
> [۱] اپنے خاص معاملات میں انسان جن امور کا عادی ہو مثلاً سونے اور کھانے پینے کی عادتیں۔ یہ نوعیت انفرادی عادت کے زمرے میں آتی ہے۔
>
> [۲] گروہوں اور جماعتوں کی عادات جو کسی فکر و تامل کے نتیجے میں پیدا ہوتی ہیں خواہ یہ عادتیں اچھی ہوں یا بری۔ یہ عادت کی وہ نوعیت ہے جو اپنے مصداق کے لحاظ سے عرف کے مترادف ہے۔
>
> [۳] ہر متکرر حالت پر عمومی لحاظ سے عادت کا اطلاق ہوتا ہے خواہ وہ:
>
> (الف) کسی طبعی سبب سے پیدا ہوئی ہو جیسے گرم خطوں میں بلوغ کی عمر کا کم ہونا اور سرد علاقوں میں اس کا زیادہ ہونا۔
>
> (ب) خواہش نفس اور اخلاقی انحطاط سے پیدا ہوئی ہو جیسے جھوٹ بولنا، دوسروں کا مال ناحق کھانا، برائیوں اور مظالم میں مبتلا ہونا۔ اسی کو فقہاء نے فساد الزمان سے تعبیر کیا ہے۔
>
> (ج) کسی خاص واقعہ سے پیدا ہوئی ہو جیسے عربوں کے عجمیوں کے ساتھ اختلاط سے ان کا عربیت کا ملکہ خراب ہو جانا۔[۲۷]

اس وضاحت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عرف کی بہ نسبت عادت میں عموم ہے یعنی عرف کے مفہوم میں بھلائی کا پہلو ملحوظ نظر ہوتا ہے لیکن عادت کے مفہوم میں یہ نہیں دیکھا جاتا بلکہ اچھے اور برے ہر قسم کے قول وفعل

اور طبعی رجحان پر عادت کا اطلاق ہوتا ہے۔ البتہ جہاں تک اصولیین کا تعلق ہے وہ ان دونوں کو عموماً مترادف الفاظ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ ہاں علامہ شامی مفہوم کے لحاظ سے ان دونوں کے درمیان فرق کے قائل ہیں۔ آپ لکھتے ہیں۔

فالعرف والعادة بمعنى واحد من حيث المصداق وان اختلفا من حيث المفهوم۔ (۲۸)

''پس عرف وعادت اگرچہ مفہوم کے لحاظ سے مختلف ہیں لیکن مصداق کے لحاظ سے متحد ہیں''۔

علامہ عبدالوھاب خلّاف بھی یہی رائے رکھتے ہیں:

العرف والعادة فی لسان الشرعیین لفظان مترادفان معناهما واحد۔ (۲۹)

''اہل قانون کی زبان میں عرف اور عادت ہم معنی اور مترادف الفاظ ہیں''۔

تحکیم کی ابتداء کیسے ہوئی:

واضح رہے کہ لفظِ معاشرہ **باب مفاعلہ** سے مصدر کا صیغہ ہے جس کے معنی ہیں باہمی طور پر مل جل کر رہنا۔ انسان کو معاشرتی حیوان بھی اسی حیثیت سے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ضروریات کی تکمیل کیلئے اجتماعی زندگی کا محتاج ہوتا ہے، انفرادی طور پر ضروریات زندگی کی فراہمی اس کی بس کی بات نہیں ہے۔ عقل سے نواز کر اسے اشرف المخلوقات کی منصب پر فائز کر دیا گیا لیکن یہی عقل ضروریات سے بڑھ کر اس کو خواہشات کی تکمیل پر ابھارنے کا سبب بنی، جس کی وجہ سے انسانوں کے اندر مخاصمانہ رویوں کا پیدا ہونا ان رجحانات کا منطقی نتیجہ تھا۔ چنانچہ انسان کی معاشرتی زندگی کی ابتداء کے ساتھ ہی مسائل اور تنازعات کا وجود بھی اس کی زندگی کا حصہ بنے۔ ان تنازعات کے تصفیہ کا عمل بھی ساتھ ساتھ شروع ہوا۔ ہر دور میں اصحاب عقل وبصیرت کے مستحسن فیصلے نظائر بن کر لوگوں کے رسم ورواج کی شکل میں ڈھل گئے اور اس طرح تحکیم کی صورت میں معاشرتی مسائل کے حل کرنے کیلئے ایک طریق کار کے خدوخال ظاہر ہونے لگے۔ ہر دور کے متمدن معاشروں نے اس سے حسب ضرورت استفادہ کیا تا آنکہ مدون قوانین کا دور آیا اور آج ہر ملک کے نظم ونسق کے اپنے اپنے قوانین ہیں جن کا معیار بھی الگ الگ ہے اور ان پر عمل درآمد کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں لوگوں کی رائے بھی ایک نہیں ہے۔ (۳۰)

علامہ صبحی محمصانی لکھتے ہیں:

''جب تمدن انسانی نے ترقی کی تو اس سے معاشرے کے حالات بھی بدلے اور انسانوں میں مختلف قسم کے تعلقات و روابط پیدا ہوگئے اور ان میں پیچیدگیاں اور دشواریاں پیش آنے لگیں۔حقوق انسانی کی حفاظت کے لیے واضح قوانین کی ضرورت پیش آئی، پھر یہ قوانین دوسری عادات ورسوم سے الگ ہونے لگے۔قبیلہ کی جگہ سردار نے لے لی اور حکومت ہی اپنے محکموں اور اجتماعی طاقت کے ذریعے تنفیذ کا کام انجام دینے لگی۔''(۳۱)

بدقسمتی سے پاکستان کے سرحدی قبائل آج بھی عدل وانصاف پرمبنی کسی مدون قانون کے زیرسایہ زندگی گزارنے سے محروم ہیں اور عموماً ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اصول کے تحت زندگی کے معاملات طے ہوتے رہتے ہیں جس کی وجہ سے یہ علاقہ عموماً خلفشار اور بدامنی کا شکار چلا آرہا ہے اور اس طرح یہ نہ صرف اندرون ملک عدم استحکام کا سبب بن رہا ہے بلکہ بیرون ملک بھی اس کے منفی اثرات مرتب ہورہے ہیں۔دراصل یہ علاقہ حکوت پاکستان اور اس سے قبل حکومت برطانیہ کا نیم خودمختارانہ حیثیت کے ساتھ حصہ رہتے ہوئے بھی ایسے جغرافیائی محل وقوع اور معاشرتی ڈھانچے کا حامل رہا ہے کہ کافی عرصہ گزرکر بھی ہزار جتن کے باوجود یہاں منظّم قانون کے نفاذ کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہوسکا۔یہاں آج بھی قبائلی عصبیت پرمبنی طرز معاشرت کا راج ہے۔ہر قبیلے کی طاقت کا راز اس کی عددی اکثریت پر ہوتا ہے۔قبیلہ قبائلی تعصّبات اور جنگوں میں افراد کو جان و مال کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے اور معاوضہ میں اپنے لیے غیرمشروط اور غیر متزلزل وفاداری کا طالب ہوتا ہے۔یہی قبائلی فطرت ہے جس نے ہر اہم اور بڑے قبیلے کو ایک آزاد اور خودمختار سیاسی ومعاشرتی وحدت کا درجہ عطا کردیا ہے۔اگر کوئی شخص خود کو تنہا اور کمزور قبیلہ کا فرد سمجھتے ہوئے ظالم کے ظلم سے تحفظ حاصل کرنا چاہتا ہے تو وہ کسی طاقتور قبیلہ کے سردار کا ہمسایہ یعنی پناہ یافتہ بن جاتا ہے جس کے بعد کوئی بھی اس پر ظلم وتعدی نہیں کرسکتا۔پہاڑی جنگلات اور غیرآباد زمینوں کے لیے قبائل کے درمیان خون ریز جنگیں ہوتی رہتی ہیں جن کو مخصوص ناموں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔یہ جنگیں ان کی غیرت وحمیت، تہور اور جواں مردی پرمبنی طرز معاشرت کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ان کے ہاں عدل گستری بھی اپنے مخصوص طرز کی ہوتی ہے۔فصل خصومات کے لیے فریقین اس شعبے کے ماہر مخصوص بااثر افراد کے گھر کے دروازے پر دنبہ کھڑا کرتے ہوئے انہیں اپنا وکیل مقرر کرتے ہیں جو عموماً صلح کی بنیاد پر معاملہ رفع دفع کرتے ہیں۔اگر اس طرح تنازعہ حل نہ ہوسکے تو پھر وکیل حضرات اس

معاملے کو شرعی احکام کے مطابق حل کرنے کی لیے قضاء کے ماہر علماء کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

وزیرستان کی حد تک لوگوں کی یہ خوش قسمتی ضرور ہے کہ ان کے آباء واجداد نے تقریباً پانچ سو سال قبل ''وزیری رواج'' کے نام سے تیس دفعات پر مشتمل ایک آئین وضع کیا۔ اس کے مطابق اپنے دور کی سادہ زندگی کے ان کے تمام تر تنازعات فیصل ہوتے رہتے تھے اور اس میں اتنی جامعیت اور لچک ہے کہ آج بھی ان ہی دفعات کی تشریح و توضیح اور معمولی تغیر و تبدل کے ساتھ ایک بڑی آبادی کے معاملات صلح کی صورت میں حل ہوتے رہتے ہیں۔(۳۲) ۱۹۶۰ء کی دہائی میں اکابر علماء کی کوششوں سے ایک انقلابی قدم یہ اٹھایا گیا کہ پوری قوم نے اتفاق رائے کے ساتھ رواجی ثالثان کے ساتھ ساتھ معاملات کے ایک ماہر عالم دین کے تقرر کا مطالبہ حکومت سے منوایا تا کہ رواجی ثالثان شرعی احکام کے ساتھ متصادم کوئی فیصلہ صادر نہ کریں۔ چنانچہ آج اگر کوئی تنازعہ پولیٹیکل ایجنٹ کے دفتر میں بھی حل ہونے کیلئے پیش ہو وہاں بھی عام ثالثان کے ساتھ ایک عالم دین کا تقرر عمل میں لایا جاتا ہے۔ سرکاری دفتر سے باہر کے تنازعات عموماً رواجی ثالثوں اور علماء کی اشتراک سے ہی طے ہوتے رہتے ہیں۔ یہ فیصلے نوے فیصد صلح پر مبنی ہوتے ہیں اور دس فیصد معاملات ایسے ہوتے ہیں جو فریقین کے اصرار پر خالص شرعی حکم کے تحت فیصل کیے جاتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ کسی تنازعے کے تصفیے کا مرحلہ متعدد جرگوں کی کافی تگ و دو کے بعد آتا ہے کیونکہ فریقین میں سے دونوں یا ایک تصفیے کیلئے تیار ہی نہیں ہوتا اور وہ ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اصول کے تحت اس کا فیصلہ کرنا چاہتا ہے جس کے نتیجے میں ظاہر بات ہے کہ بہت سی قیمتی جانیں ضائع ہوتی ہیں اور کافی نقصان کے بعد فیصلہ پھر بھی جرگے اور حَکَمین کے ذریعے ہی ہوتا ہے۔ ہاں ایک بات کی وضاحت یہاں ضروری ہے کہ ان رواجی اور مبنی بر تحکیم فیصلوں کی پابندی کسی پر لازم نہیں ہوتی اور اگر کوئی اس سے انکار کردے تو کوئی قوت نافذہ ایسی نہیں ہے جو اس کی پابندی کرانے پر مجبور کردے اگرچہ اس صورت میں جرگہ اس کو قصوروار ٹھہراتا ہے لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں پر ایک منظّم قانونی حکومت اور ایک قبائلی نظام پر مبنی معاشرے کا فرق بدیہی طور پر واضح ہوجاتا ہے۔

کچھ یہی صورت حال قبل از اسلام عرب معاشرے کی بھی تھی۔ ان کی سیاسی اور معاشرتی زندگی کا مرکز ومحور قبیلہ تھا جو بنیادی طور پر خون کے رشتے کی اساس پر ایک انسانی گروہ ہوتا تھا۔ ہر قبیلہ خلف ولاء اور جوار کے مصنوعی رشتوں کی بناء پر اپنے ارکان کے عددی قوت اور اس کے نتیجے میں عسکری طاقت بڑھاتا رہتا تھا۔ عموماً

اس کا پس پردہ محرک دشمن قبائل کے خلاف سیاسی اور عسکری اتحاد قائم کرنا ہوتا تھا۔ چنانچہ عرب کے قبائلی نظام میں سماجی تحفظ کا سرچشمہ قبیلہ کی اجتماعی طاقت ہوتی تھی۔ یہی قبائلی فطرت تھی جس نے ہر قبیلے کو ایک خودمختار حیثیت کا درجہ عطاء کیا تھا۔ اس قبائلی نظام میں ریاست کا کوئی تصور نہ تھا، مرکزیت و اجتماعیت مفقود تھی۔ نتیجہ یہ کہ بدوی قبیلوں کی زندگی باہمی اختلافات، چپقلش، نزاع اور تصادم و تحارب کی مجسم تصویر تھی۔ (۳۳) لیکن اسلام کی آمد کے بعد اس کے پیروکاروں کو باقاعدہ طور پر اسلامی قوانین کی اطاعت کا پابند بنادیا گیا اور وہی معاشرہ جو قبائلی طرز تمدن پر مبنی تھا، اسلامی معاشرہ بن گیا۔ اس انقلاب میں اسلام نے عربوں کے رسم و رواج پر بالکل خط تنسیخ نہیں کھینچا بلکہ جہاں رسم و رواج کو اسلامی احکام کے ساتھ ہم آہنگ پایا اس کو سند جواز عطا کیا۔ جہاں معمولی ردو بدل کر کے اصلاح کی جاسکتی تھی، اصلاح کردی گئی اور جہاں ان کے طور طریقے اسلامی تعلیمات کے ساتھ متصادم نظر آئے، وہاں نئے احکام دیے گئے۔ بقول مولانا تقی امینی ''پیغمبر حضرات موجودہ احکام و مراسم اور لوگوں کے مرغوبات و مالوفات کے قلع قمع کرنے میں شمشیر بے نیام نہیں ہوتے کہ جو بات مروج دیکھی اس کو ختم کردیا یا جو لوگوں کی پسندیدہ چیز ہوئی اس سے روک دیا، بلکہ لوگوں کی نفسیات کے پیش نظر ''خذ ما صفا ودع ما کدر'' (جو صاف ہو اس کو لے لو اور جو گدلا ہو اسے چھوڑ دو) پر عمل کرتے ہیں''۔ (۳۴) چنانچہ یہ حقیقت آج بھی مسلم ہے کہ اسلامی تعلیمات میں عصر حاضر میں بھی تحکیم کی اہمیت اپنی جگہ برقرار ہے اور اس کے مثبت پہلو کسی بھی دور میں از کار رفتہ نہیں قرار دیے جاسکتے۔ وزیری آئین یا وزیری رواج کی روشنی میں کم از کم یہ بات مشاہدے سے ثابت ہے کہ تحکیم پر مبنی اس نظام نے وزیرستان کے قبائلی معاشرے کے معاملات حل کرنے کیلئے کبھی بھی کسی خلاء کا احساس نہیں ہونے دیا ہے۔ یہی اسلامی تعلیمات کی جامعیت کا واضح ثبوت ہے کہ اس کے ایک دفعہ یعنی تحکیم سے ایک بڑی آبادی کے مسائل کسی مدون قانون کی عدم موجودگی میں بھی خوش اسلوبی سے حل ہوتے رہے ہیں۔

اسلام میں تحکیم کی اہمیت:

اسلام دین فطرت ہے۔ اس نے اپنے پیروکاروں کی رہنمائی ایک ایسے ضابطہ حیات کی طرف کی ہے جس پر عمل درآمد آسان اور سہل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کو جب بھی دو باتوں کے درمیان اختیار دیا گیا، آپ ﷺ نے آسان تر کو عمل کیلئے اختیار فرمایا۔ جیسے پہلے عرض کیا گیا کہ انسان اجتماعی زندگی کے بغیر ضروریات

زندگی کی تکمیل نہیں کر سکتا اور اجتماعی زندگی میں مفادات کے حصول میں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکراؤ انسان کی پہلی نسل سے چلا آرہا ہے۔ٹکراؤ کے نتیجہ میں تنازعات پیدا ہوئے اور تنازعات کے حل کی ضرورت نے انسان کو تصفیے کا شعور دیا۔ چنانچہ یہاں سے تحکیم کا سلسلہ شروع ہوا۔ اور لوگ تحکیم سے مانوس ہونے لگے، لوگوں کے تنازعات بغیر خون خرابہ کے طے ہونے کا آغاز ہوا اور انہیں جان و مال کے تحفظ کا احساس ہونے لگا۔ پھر جب لوگوں نے دیکھا کہ قطع خصومات کیلئے یہ آسان ترین طریقہ ہے، حَکَم کے تقرر سے مختصر وقت میں کسی متنازعہ امر کا تصفیہ جبر سے نہیں بلکہ باہمی رضامندی اور صلح سے ہوجاتا ہے، انصاف کے تقاضے بھی پورے ہوجاتے ہیں اور غیر معمولی خرچے اخراجات بھی نہیں آتے ہیں تو انہوں نے اس عمل کو تحسین کی نظروں سے دیکھا اور جب تک منظّم حکومتوں کی قیام کے ساتھ عدالتی نظام کا وجود عمل میں نہیں آیا، حصول انصاف کیلئے تحکیم ہی واحد ذریعہ تھا۔

تاریخ کے بعد کے ادوار میں سب سے پہلے یونانی معاشرہ تحکیم سے مستفید ہوا اور اس کی وجہ سے ان کے شخصی اور گروہی اختلافات حل ہونے کی ابتداء ہوئی۔ یہ اختلافات دینی بھی تھے اور دنیاوی بھی، معاشی بھی تھے اور معاشرتی بھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ تحکیم کی شکل و صورت بھی مختلف ادوار میں مختلف رہی۔ ابتداء میں مدعی اور مدعا علیہ کو مختلف قسم کی کڑی آزمائشوں سے گزارا جاتا تھا۔ مثال کے طور پر ابلتے پانی میں ہاتھ ڈالنا، تپتے انگاروں کو ہاتھ میں لینا یا ان پر چلنا وغیرہ۔ بعض اوقات فریقین کو بھڑایا جاتا تھا اور جو غالب آتا فیصلہ اس کے حق میں ہوتا۔(۳۵) عربوں میں اسلام سے پہلے کوئی منظّم شخصی یا عوامی حکومت موجود نہیں تھی جو طاقت کے ساتھ معاشرتی جرائم کی روک تھام کر سکے۔ ہر قبیلے کا اپنا سردار ہوتا تھا جو قبیلے کے اندرونی اور بیرونی معاملات کا تصفیہ مروجہ طور طریقوں کے مطابق کرتا۔ سردار چونکہ اپنے دور کے لحاظ سے صاحب بصیرت اور ذی رائے ہوتا اس لیے لوگوں کے پاس اس کا فیصلہ ماننے کے علاوہ کوئی اور چارہ کار باقی نہ رہتا۔ کبھی کبھار دو قبیلوں کے درمیان کوئی تنازعہ اٹھ کھڑا ہوتا جس کیلئے کسی تیسرے قبیلے کے سردار کو حکم بنا کر اس سے تصفیہ کرایا جاتا۔ بعض اوقات ایک قبیلہ کے دو افراد کے درمیان سردار بننے پر تنازعہ پیدا ہوتا اور اس کا فیصلہ بھی کسی تیسرے قبیلہ کے سردار کے تقرر سے ہوتا۔ تنازعات کا فیصلہ کرانے کیلئے وقتاً فوقتاً کاہنوں سے بھی مدد لی جاتی تھی۔ مشہور حَکَم افراد کے سلسلے میں مؤرخین نے حاجب بن زرارہ، اقرع بن حابس، قس بن ساعدہ، اکثم صیفی اور عبدالمطلب بن ہاشم کے نام ذکر کیے ہیں۔(۳۶)

ڈاکٹرشہناز صاحب لکھتے ہیں:

''اسلام سے قبل یعنی زمانہ جاہلیت میں یہ رواج تھا کہ تنازعات کا فیصلہ طے کرنے کیلئے فریقین کسی کوحَکَم بنالیتے تھےاوراس کے فیصلہ کاانتظارکرتے۔پھراگرحَکَم کافیصلہ فریقین میں سے کسی کیلئے قابل قبول نہ ہوتاتووہ کسی اورکوحَکَم بناتا،اگراس کافیصلہ بھی منظورنہ ہوتاتو کسی تیسرے شخص کوحکم بنایا جاتا اور یہ سلسلہ چلتا رہتا تاآنکہ فریقین کسی ایسے حَکَم کو پالیتے جس کا فیصلہ دونوں کیلئے قابل قبول ہوتا۔یوں یہ طریقہ کارعہدرسالت تک جاری رہا''۔(۳۷)

العجلانی لکھتے ہیں:

کان الناس اول الامر یحلون خصوماتھم بطریقة التحکیم التی عرفوھا فی الجاھلیة و کانوا بالخیار بین القبول بقضاء الحَکَم او رفضه حتی ان بعضھم احتکم الی رسول اللهﷺ نفسه و لم یرض بحکمه، فنزلت ھذه الآیة:فَلَا وَرَبِّكَ لَا یُؤمِنُوْنَ۔۔۔الخ(۳۸)

''شروع شروع میں لوگ اپنے جھگڑوں کافیصلہ پنچایت کےطریقہ سے کرتے تھے جوانہوں نے زمانہ جاہلیت ہی سے سیکھ رکھا تھااور پنچ کافیصلہ ماننے یارد کرنے میں وہ آزاد تھے،یہاں تک کہ ان میں سے کسی نے اپنا کیس نبی اکرمﷺ کی خدمت میں پیش کیالیکن آپؐ کے فیصلہ سے راضی نہ ہوا۔چنانچہ یہ آیت طیبہ نازل ہوئی فلا و ربك لا یومنون حتی یحکّموك فیما شجر بینھم الخ''۔

حضورؐ کے منصب قضاء سنبھالنےاوراورتائیدالٰہی آجانے کے بعدزمانہ جاہلیت کاوہ رواج ختم ہوا کہ

ایک قاضی یا حَکَم کا فیصلہ منظور نہ ہوتو دوسرے اور تیسرے کے پاس جا کر مقدمہ پیش کیا جائے اور جب تک من پسند فیصلہ سامنے نہ آئے، حَکَم بنانے کا سلسلہ جاری رہے۔ چنانچہ اسلامی ریاست کے قیام کے ساتھ ہی ریاست کے باشندوں پر لازمی قرار دیا گیا کہ وہ اپنے تنازعات کا فیصلہ بارگاہ نبوی سے کرائیں۔ اور جو بھی فیصلہ اس عدالت عظمیٰ سے صادر ہو اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کریں۔ (۳۹) اسلام جب اپنی تمام تر شفقتوں کے ساتھ جزیرۃ العرب پر سایہ فگن ہوا، اس نے حق وانصاف کا بول بالا کرنے کیلئے عربوں کے اس روایتی طریقے یعنی تحکیم کو غیر معمولی اہمیت دی، حقوق اللہ کی بجائے حقوق العباد پر زور دیا اور حقوق العباد کی بہتر ادائیگی میں سہل الحصول انصاف کو کلیدی حیثیت عطاء کی۔ اسلام کے ابتدائی دور میں معاشرہ بہت سادہ تھا۔ پیچیدہ معاشی اور معاشرتی زندگی سے لوگ قطعاً ناواقف تھے۔ اس دور کا اہم معاملہ گھریلو زندگی کا ہوتا تھا کیونکہ اسی پر پورے خاندان کی صلاح وبقاء کا دارومدار ہوتا ہے جو بالواسطہ طور پر معاشرہ کو شکست وریخت سے تحفظ دینے کی ضمانت بنتا ہے۔ چنانچہ گھریلو ناچاقی کے تصفیہ کیلئے اللہ تعالی نے تحکیم کا حکم دیا۔ ارشاد ہوا۔

﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِنْ اَهْلِهَا اِنْ يُرِيْدَا اِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا﴾۔ (۴۰)

''اگر تمھیں زوجین کے درمیان چپقلش پیدا ہونے کا ڈر ہو تو ایک فیصل خاوند کے خاندان کی طرف سے اور ایک بیوی کے خاندان کی طرف سے مقرر کرو۔ اگر زوجین کا اصلاح احوال کا ارادہ ہو، اللہ تعالی انہیں اس کی توفیق دیگا۔''

تحکیم کے بارے میں اگر ہم عمیق انداز سے غور وفکر کریں تو اس میں دو قسم کی بھلائی ہے ایک تو یہ کہ اس کے ذریعے مختلف فیہ معاملہ حل ہو جاتا ہے اور دوسری یہ کہ قاضی کی عدالت کے برعکس بیشتر معاملات صلح کے ذریعے طے پا جاتے ہیں اگرچہ بعض اوقات شرعی عدالت کا طریق کار اختیار کیا جاتا ہے۔ علاوہ ازیں تحکیم کی صورت میں معاملات حل کرنے میں آسانی کا پہلو بھی موجود ہے جو اسلام کو مطلوب ہے۔ ارشاد خداوندی ہے۔

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (۴۱)

''اللہ تعالی تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا۔''

یہ بات واضح ہے کہ آسانی تحکیم میں ہے کیونکہ فریقین جہاں کہیں بھی ہوں، معمولی اجرت پر ثالث مقرر کر کے اپنا

تنازعہ حل کرا سکتے ہیں اور یہ سہولت عدالتی نظام میں موجود نہیں۔ باقاعدہ عدالتی نظام میں قاضی سماعت کیلئے ایک خاص تاریخ مقرر کرتا ہے، اس کا ایک خاص دفتر ہوتا ہے جہاں اپنی باری کا انتظار کرنا پڑتا ہے اور اس طرح اس میں جہد و مشقت اور ضیاع وقت و مال ہوتا ہے۔

عرب میں اسلام سے پہلے تحکیم کا تصور واضح طور پر موجود تھا:

عربوں کی زمانہ جاہلیت کی تاریخ سے یہ بات واضح ہے کہ اسلام نے عوام الناس کی سہولت کی خاطر عرب کے ان رسوم ورواجات کو سند جواز عطاء کی جو اسلام کی بنیادی تعلیمات کے ساتھ متصادم نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ نومسلم عربوں نے جب اسلامی احکام کو اپنے دود و دستور کے ساتھ ہم آہنگ پایا تو انہیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ ابتداء میں مکہ والوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے اس نئے دین کو درخور اعتناء نہیں سمجھا۔ چنانچہ دیگر بہت سی باتوں کی طرح تحکیم یعنی ثالثی کا تصور بھی قبل از اسلام عرب معاشرہ کے اقدار کے جزو کی حیثیت سے اسلامی تعلیمات کا حصہ بنا۔

پاکستان کے سرحدی قبائل کی طرح اسلام سے پہلے عربوں میں کوئی منظم حکومت موجود نہ تھی۔ ڈاکوؤں، لٹیروں اور قاتلوں کے ہاتھ روکنے والی طاقت موجود نہ تھی اور ''جس کی لاٹھی اس کی بھینس'' کے اصول کے تحت زندگی رواں دواں تھی۔ البتہ رسم ورواج کے تحت قبیلہ کا سردار اس کا مجاز ہوتا تھا کہ وہ فریقین کے درمیان تصفیہ کرائے۔ عرب جاہلیہ کی تاریخ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شعر وشاعری کے تنازعات کے فیصلے کا فریضہ عموماً عکاظ کے میلہ میں نابغہ ذبیانی سرانجام دیا کرتے تھے۔ اسلام سے پہلے کے معاشرہ میں مستند روایات سے حجر اسود اپنی جگہ رکھنے کے بارے میں قریش مکہ کے درمیان تنازعہ پیدا ہونے اور حضورؐ کی ثالثی قبول کرنے کی مثال موجود ہے۔ علاوہ ازیں سیرت ابن ہشام کے حوالہ سے حضرت علیؓ سے زم زم کے کنویں کے بارے میں عبدالمطلب کے ساتھ قریش مکہ کا تنازعہ مذکور ہے جس کے تصفیہ کیلئے انہوں نے شام کے بنوسعد قبیلہ کے ایک کاہنہ کو ثالثہ بنانے پر اتفاق کیا۔ لیکن راستے میں کچھ ایسے آثار ظاہر ہوئے کہ دیگر سرداروں نے کاہنہ کے فیصلہ سے پہلے ہی عبدالمطلب کو اس کا متولی تسلیم کیا۔ [۴۲]

اسلام نے عرب معاشرہ کے تحکیم کے تصور کو برقرار رکھا:

اسلامی تعلیمات کا بنیادی فلسفہ یہ رہا ہے کہ معاشرہ مثبت رجحانات کا حامل ہو۔اختلافات وتنازعات کے اسباب کی بیخ کنی ہو اور خدانخواستہ اگر ایسے ناپسندیدہ امور سامنے آئیں تو جلد از جلد انہیں ختم کر کے امن و آشتی کے جذبات کو فروغ دیا جائے۔قرآن نے واضح طور پر ایسی ہدایات دی ہیں جن سے تفرقہ واختلاف کی کیفیت میں حالات کو سدھارنے کی رہنمائی ملتی ہے۔خاندان معاشرہ کیلئے بنیادی اکائی ہے۔بہت سی اکائیاں مل کر معاشرہ جنم لیتا ہے۔اس لیے اسلام نے اس بات پر زور دیا ہے کہ خاندان میں استحکام موجود ہو اور یہ تب ہی ممکن ہوسکتا ہے جب زوجین میں ہم آہنگی ہو۔اگر میاں بیوی کے درمیان عدم موافقت کی فضاء پائی جاتی ہے تو اس کے ناخوشگوار اثرات اولاد اور متعلقہ خاندانوں پر مرتب ہوکر معاملہ مزید الجھ جاتا ہے۔چنانچہ اسلام نے اس سلسلے میں بذریعہ تحکیم تصفیہ کرنے کا حکم دیکر معاشرہ کے اس بنیادی اکائی کو تحفظ دینے پر زور دیا ہے۔

ارشاد خداوندی ہے۔

﴿وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُواْ حَكَماً مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَماً مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلاَحاً يُوَفِّقِ اللّهُ بَيْنَهُمَا إِنَّ اللّهَ كَانَ عَلِيماً خَبِيراً﴾[۴۳]

''اگر تمہیں معاملہ الجھ جانے کا خطرہ ہو تو ایک ثالث خاوند کے گھر کا کوئی فرد اور ایک ثالث بیوی کے خاندان والوں کی طرف سے مقرر کردو۔اگر وہ صلح کے خواہاں ہوں گے تو اللہ تعالیٰ انہیں توفیق عطاء کرے گا۔بے شک وہ جاننے والا اور باخبر ہے۔''

یہاں معاملہ اللہ تعالیٰ نے حکمین کے سپرد کردیا اور حکمین بھی میاں بیوی کے خاندانی افراد ہوں تا کہ معاملہ کے تمام نشیب وفراز معلوم کرنے کے بعد وہ خیر خواہی کے جذبے سے اس کو سلجھادیں۔اسی طرح اللہ تعالیٰ نے گروہی اور قومی تنازعات کی صورت میں مسلمانوں پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ وہ صلح اور مفاہمت کی کوشش کریں تا کہ عدل وانصاف پر مبنی معاشرہ قائم ہو اور مسلمان آپس کی خون ریزی سے محفوظ رہیں۔اور خدانخواستہ اگر حالات سدھرتے نہیں تو ظالم کے خلاف طاقت کا استعمال آخری آپشن رہے۔قرآن کی واضح ہدایت ہے:

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّى تَفِيءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ[۴۴]

''اگر مسلمانوں کے دو گروہوں کے درمیان لڑائی چڑھ جائے تو ان کے درمیان صلح کرو۔اگر کوئی فریق پھر بھی سرکشی پر اتر آئے تو سرکشی کرنے والوں کے خلاف لڑو یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کے آگے سرتسلیم خم کریں۔''

یہاں اللہ تعالیٰ نے صلح کرانے کا حکم دیا ہے اور صلح کرانے والے جبر نہیں کر سکتے کیونکہ یہ قاضی یا حکومت وقت کا کام ہوتا ہے۔صلح کرانے والے حکمین ہی ہوتے ہیں حاکم نہیں ہوتے۔

شریعت اسلامی کی رو سے قاضی اور حَکَم میں فرق:

حَکَم اور قاضی کا فرق مندرجہ ذیل امور سے واضح کیا جا سکتا ہے۔

[۱] قاضی کے اختیارات ان تمام لوگوں پر حاوی ہوتے ہیں جو اس کے منصب کی حدود میں آتے ہیں جبکہ ثالث کے اختیارات صرف فریقین تک محدود ہوتے ہیں کیونکہ فریقین ہی نے اس کو فیصلہ کرنے کے اختیارات تفویض کیے ہیں۔اگر فریقین اس کو یہ اختیار نہ دیتے وہ فیصلہ کرنے کا مجاز ہرگز نہ ہوتا۔

[۲] حَکَم کے تقرر پر فریقین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے جبکہ قاضی کے تقرر میں کسی کی رضامندی کی ضرورت نہیں ہوتی کیونکہ قاضی کا تقرر حاکم وقت کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔چاہے کوئی خوش ہو یا ناخوش،قاضی قاضی ہوتا ہے۔برخلاف اس کے حَکَم اس وقت حَکَم ہوتا ہے جب فریقین اس کی یہ حیثیت قبول کرنے پر آمادہ ہوں۔

[۳] قاضی کے فیصلے کی صورت میں اس کے اثرات فریقین کے علاوہ دوسرے لوگوں پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔مثلاً اگر قتل خطاء کا معاملہ ہے اور قاضی قاتل کو دیت کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے تو از روئے شریعت یہ بوجھ عاقلہ پر پڑتا ہے۔تحکیم کی صورت میں ایسا نہیں ہوتا کیونکہ اس کی حقیقت صلح جیسی ہوتی ہے اور صلح کی صورت میں عاقلہ پر دیت کی ادائیگی کا بوجھ نہیں آتا۔

[۴] تحکیم کے معاملہ میں دو حَکَم ایک ہی وقت میں ثالث بن سکتے ہیں۔اس صورت میں اگر ان کے درمیان فیصلہ کرنے میں اختلاف رائے پیدا ہو جائے تو ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی ایک کی رائے کی بنیاد پر فیصلہ سنا دیا جائے۔اس سلسلے میں یہ ضروری ہے کہ دونوں ثالث ایک حکم پر متفق ہوں۔قضاء کی صورت میں شرعاً یہ جائز نہیں کہ ایک مسئلہ کیلئے دو شخص قاضی بن کر فیصلہ سنا دیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ قاضی کو اختیار عام حاصل ہوتا ہے جس

طرح کسی مملکت کا حکمران ایک ہوتا ہے یا نماز با جماعت میں امام ایک ہوتا ہے۔ تو جس طرح نماز میں دو امام نہیں بن سکتے اور مملکت کے دو حکمران نہیں ہو سکتے، اسی طرح کسی فیصلہ کے تصفیہ کیلئے دو قاضی مقرر نہیں کیے جا سکتے۔ ہاں یہ الگ بات ہے کہ ابتداء ہی سے متعدد افراد پر مشتمل قضاۃ کا ایک بنچ بنایا جائے کیونکہ اس صورت میں متعدد قاضی ایک قاضی کے حکم میں ہوتے ہیں۔

[۵] ثالث میں تحکیم کے معاملات نمٹاتے اور حکم دیتے وقت حَکَم بننے کی اہلیت لازمی ہے برخلاف اس کے قاضی کی قضاء کسی ایسی شرط کے ساتھ مشروط نہیں۔ مثال کے طور پر اگر ثالث خدانخواستہ مرتد ہو کر پھر اسلام لے آیا تو اس کا سابقہ حکم کالعدم ہو کر از سر نو تحکیم کی ضرورت ہوگی۔ قاضی کی قضاء ایسی شرائط کے ساتھ مشروط نہ ہوگی۔

[۶] ثالث کا فیصلہ سنانے سے پہلے فریقین میں سے کوئی بھی اس کو معزول کر سکتا ہے۔ قاضی کو نہ کوئی معزول کر سکتا ہے اور نہ اس کے حکم کو باطل قرار دے سکتا ہے۔

[۷] ثالث کی ثالثی صرف اپنے شہر اور علاقہ تک محدود نہیں ہوتی بلکہ وہ کہیں بھی ثالثی کر سکتا ہے۔ برخلاف اس کے قاضی کی قضاء صرف اس کے ماتحت علاقوں تک محدود ہوتی ہے۔

[۸] حَکَم اگر تہمت کی وجہ سے کسی گواہ کی گواہی رد کر دے تو دوسرا ثالث اس کی گواہی قبول کر سکتا ہے لیکن اگر قاضی کسی کی گواہی کو مسترد کرے تو اس کی گواہی کوئی بھی قبول نہیں کر سکتا کیونکہ شہادت کے رد ہونے کا فیصلہ تمام لوگوں پر نافذ ہے۔

[۹] ثالث اپنا مقدمہ کسی دوسرے کے حوالے نہیں کر سکتا جب تک فریقین کی طرف سے اس کی اجازت نہ ہو۔ قاضی کسی مقدمہ کو اپنے نائب کے حوالے کر سکتا ہے۔

[۱۰] قضاء کی صورت میں قاضی مجلس قضاء کے اندر فیصلہ سنانے کا پابند نہیں ہوتا لیکن حَکَم مجلس تحکیم برخاست ہونے سے پہلے فریقین کو اپنا فیصلہ سنانے کا پابند ہوتا ہے کیونکہ مجلس قضاء برخاست ہونے کے بعد اس کا فیصلہ قابل قبول نہیں ہوتا۔ (۴۵)

تحکیم کی مشروعیت کا فلسفہ:

اسلامی ضابطہ حیات میں کسی بنیادی اصول کے پس پردہ کوئی نہ کوئی مثبت محرک ضرور کارفرما رہتا ہے

تا کہ معاشرہ میں ایسا خلاء پیدا نہ ہو جس کی وجہ سے فرد، جماعت اور حکومت کو حقوق و فرائض کی ادائیگی میں مشکلات کا سامنا ہو۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ معاشرہ میں ایک کی مصلحت دوسرے کیلئے مضرت ثابت ہوتی ہے جس کی وجہ سے تعلقات میں تناؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ شریعت اسلامی کا اولین مطمع نظر یہ ہے کہ صاحب حق کو اپنا حق حاصل ہو۔ ظاہر بات ہے کہ اسلام نے اپنے پیروکاروں کیلئے ہر موقع پر آسانی کے پہلو کو ترجیح دی ہے تا کہ اسلامی تعلیمات پر عمل درآمد کرنے کیلئے لوگوں کو مشکلات درپیش نہ ہوں۔ تنازعات کے حل کیلئے اگر صرف قاضی کی عدالت ہی واحد ادارہ ہوتی تو لوگوں کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا حالانکہ ارشاد خداوندی ہے۔

﴿ يُرِيدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾(۴۶)

''اللہ تعالیٰ دین (پر عمل درآمد) کے بارے میں تم پر آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا''

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے ازدواجی زندگی میں پیش آمدہ مشکلات حل کرنے کیلئے تحکیم کو خصوصی اہمیت دی ہے کیونکہ ایسے معاملات اکثر پیش آتے رہتے ہیں۔ اگر ان کیلئے قاضی کی عدالت کے چکر کاٹنے پڑیں اور وقت ضائع کیے بغیر حسب موقع تصفیہ نہ ہو جائے تو معاملات حل ہونے کی بجائے الٹا بگڑ جانے کے خطرے سے دوچار ہو سکتے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امت مسلمہ کی معاشی اور معاشرتی زندگی کے مسائل کے حل کیلئے تحکیم کی مشروعیت کا اہم فلسفہ آسانی کے ساتھ عوام الناس کا حصول انصاف تک رسائی ہے حالانکہ تحکیم کی مشروعیت کی وجہ سے حکومتی رٹ بھی متاثر ہو سکتی ہے کیونکہ عوامی معاملات سرکاری عدالت سے باہر باہر طے ہوتے رہتے ہیں اور حکومتی گرفت نہ ہونے کی وجہ سے بعض اوقات جانبین میں تلخیاں پیدا ہونے کا اندیشہ بھی موجود رہتا ہے۔ تحکیم کی مشروعیت میں بڑی حکمت یہ ہے کہ اس میں کسی معاملے کو صرف حل کرنا مقصود نہیں ہوتا بلکہ اس کو صلح کے ذریعے حل کرنا مطلوب ہوتا ہے اور جب کوئی معاملہ صلح کے ساتھ حل کیا جاتا ہے تو مستحق کو حق وصول ہونے کے ساتھ ساتھ فریقین کے درمیان بھائی چارے کی فضاء بھی مکدر نہیں ہوتی۔ برخلاف اس کے قاضی اپنا فیصلہ سنا کر یہ نہیں دیکھتا کہ کوئی خوش ہے یا ناخوش، اور نہ ہی کسی کو سرتابی کا موقع ہوتا ہے کیونکہ اس کی پشت پر قوت نافذہ موجود رہتا ہے اس لیے فیصلہ اگر ہو بھی جاتا ہے دل کی کدورت پھر بھی باقی رہتی ہے۔(۴۷)

عرب معاشرے کے ساتھ وزیرستان معاشرے کی مماثلت اور تحکیم پر مبنی فیصلوں کا رواج:

واضح رہے کہ وزیرستان کا معاشرہ قبل از اسلام عرب معاشرے کے ساتھ گہری مماثلت رکھتا ہے۔

عربوں میں بھی قبائلی سرداری نظام تھا اور وزیرستان آج بھی اسی نظام کا ایک نمونہ ہے۔ حجاز کے عرب بھی کسی قانون اور نظم ونسق سے نا آشنا تھے، وزیرستان کے بارے بھی کسی تاریخی مأخذ سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ اس علاقے پر کسی نے حکمرانی کی ہو۔ عربوں میں بھی معاشرتی زندگی کے معاملات وتنازعات کے حل کی باگ ڈور سرداروں کے ہاتھوں میں تھی، وزیرستان میں آج بھی یہی سسٹم جاری وساری ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وزیرستان کے مَلِک انگریزوں کی ہزار جتن کے باوجود اتنے بااثر نہ ہوسکے جتنے عرب سردار تھے یا جیسے دور حاضر میں جو مقام بلوچستان اور سندھ کے سرداروں یا وڈیروں کو حاصل ہے۔ تمام قبائل کی بالعموم اور وزیرستان کی بالخصوص ہر دور میں اپنی آزادی برقرار رکھنے کی بنیادی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ ایک تو یہ علاقہ اس قدر دشوار گزار ہے کہ ابتداء ہی سے کسی بیرونی حملہ آور نے اس پر یلغار کرکے اسے زیر تسلط لانے کی قسمت آزمائی نہیں کی ہے اور دوسری یہ کہ یہ لوگ اپنے علاقے میں لڑنے کے اس قدر ماہر ہیں کہ شاید کسی ایک کی مہم جوئی بعد میں آنے والوں کیلئے تازیانہ عبرت بن گئی ہو۔ چنانچہ عرصہ دراز تک آزادانہ زندگی بسر کرنے کے نتیجے میں ان کے اندر احساس حریت اس قدر شدت اختیار کرگیا کہ وہ اس کو برقرار رکھنے کیلئے ہر قسم کی قربانی دینے پر آمادہ ہونے لگے۔ مغل، سکھ اور انگریز حکمرانوں کے ادوار اور قیام پاکستان کے بعد کے حالات وواقعات اس دعویٰ کے ثبوت کیلئے بطور استدلال پیش کئے جاسکتے ہیں۔ باقاعدہ قانون کی حکمرانی سے بچنے کے باوجود یہاں کے باسی کسی ایسے ضابطہ حیات سے خود کو مستغنی قرار نہیں دے سکے جو ان کے درمیان آئے روز کے معاملات وتنازعات کو حل کرنے کی ضرورت کی تکمیل کرسکے۔ چنانچہ جو کوئی طریق کاران کے بزرگوں اور دانشمندوں نے تنازعات ومعاملات کے تصفیہ کیلئے اختیار کیا اور لوگوں نے اسے تحسین کی نظروں سے دیکھا، عوام الناس نے اسے قبول کرکے اپنا رواج بنایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج قبائلی علاقوں میں جو معاشی ومعاشرتی معاملات پیش آتے ہیں ان کا تصفیہ عمومًا تحکیم (ثالثی) ہی کی بنیاد پر کیا جاتا ہے۔ وزیری آئین میں تحکیم ہی کی روح کارفرما ہے۔ البتہ جیسے پہلے بھی عرض کیا گیا ہے کہ وزیرستان میں یہ سبقت صرف احمد زئی قبیلہ کو حاصل ہے کہ یہاں اکابر علماء کی تحریک پر عوام نے متفقہ طور پر حکومت سے یہ مطالبہ کیا کہ پولیٹیکل ایجنٹ کی عدالت میں پیش کسی مقدمہ میں ثالثوں کے ساتھ قضاء کے معالات کے کسی ماہر عالم دین کی موجودگی یقینی بنائی جائے تاکہ ثالث حضرات کوئی ایسا فیصلہ صادر نہ کریں جو شرعی احکام کے ساتھ متصادم ہو۔ حکومت نے یہ مطالبہ بصد خوشی منظور کیا اور آج وزیرستان میں

تقریباً تمام تنازعات میں قاضی کی موجودگی ضروری سمجھی جاتی ہے۔ بعض اوقات کوئی ایک فریق صرف رواج کے مطابق فیصلہ کرنے پر اصرار کرتا ہے کیونکہ شرعی فیصلہ کی صورت میں اس کو مقدمہ ہار جانے کا خطرہ ہوتا ہے لیکن عوامی بدنامی اور طرفین کے وکلاء کی باہمی مشاورت کے بعد ان کے مقدمہ کے تصفیہ کیلئے علاقے میں قضاء کے معاملات کے ماہر علماء میں سے دو بطور حَکَم مقرر کیے جاتے ہیں۔

وزیری آئین (رواج) کی ابتداء اور اہمیت وافادیت:

محمد حیات خان اس رواج کے ایجاد کرنے اور اس کی اہمیت وافادیت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں

''اب دیگر حالات متعلقہ اس قوم سے پہلے اس بگڑے آئین کی تشریح کی جاتی ہے جو اس قوم کا خانگی دستور العمل ہے۔ واضح ہو کہ اس آئین کو یہ لوگ باصطلاح خود ''دوزیر ونرخ'' کہتے ہیں جس کے معنی وزیری عرف اور رسم کے ہیں۔ اس آئین کے سبب سے آپس میں اتفاق اور کار کے واسطے کافی ضبط رہتا ہے اور اس بات کے واسطے ان کا رواج اور اس کا نتیجہ اس بات کی دلیل ہے کہ آئین خواہ کیسا ہی ناقص ہو، بے آئینی سے بہتر ہے۔

کہتے ہیں کہ ابتداء میں اس قوم کے بیچ بھی مثل دیگر آزاد پشتون قوموں کے کوئی دستور مقرر نہیں تھا اور چونکہ یہ قوم خصوصًا شاخ احمد زئی واتمان زئی بطور خانہ بدوشاں کوچی رہتے تھے، جہاں اچھی چراہ گاہ دیکھی وہاں چند روز (خیمے) لگا کر گزارہ کیا اور پھر اس جگہ سے مال مویشی لیکر چل دیے۔ ایسی آوارہ گردی اور کم حفاظت کے سبب سے اور دیگر قوموں کی دشمنی کے باعث سے ضرورت پڑی کہ واسطے اتفاق اور انفصال معاملات باہمی کوئی رواج مقرر کیا جاوے۔ ایسے وقت میں ایک مقدمہ مابین فرقہ

شادی خیل وفرقہ محمد خیل سپیر کے وزیراں ایسا برپا ہوا کہ جس سے نفاق قوم نمودار تھا یعنی ایک عورت مسماۃ ''گرانئے'' قوم شادی خیل کسی محمد خیل سپیر کے گھر بدون رضامندی والدین چلی آئی تھی اور اس کے واپس لیجانے کے واسطے شادی خیل لشکر اپنی قوم جمع کر کے محمد خیلوں پر چڑھ آئے تھے اور قریب تھا کہ دونوں فرقوں میں شدید کشت وخون ہو۔ اُس تنازعہ کے فیصلہ کے واسطے اکثر ملکان کلاں ہر ایک شاخ وزیراں جمع ہوئے اور اُس جھگڑا کو صلح سے طے کر کے جہت انتظام آئندہ اس ''آئین'' کو ایجاد کر کے اُس مجمع میں تقریر کی گئی اور سب نے اتفاق کے واسطے دعائے خیر کی۔ اُس جرگہ میں بڑے ملک اور اس آئین کے زیادہ موجد وصیاح کار مسمیان اسکندر ولد مدی قوم توری خیل وجبر میت خیل وکاجی کابل خیل باعانت دیگر ملکان تھے۔ بعض ہوشیار آدمی اس قوم کے کہتے ہیں کہ دس یا بارہ پُشت گزرے ہیں جسکا عرصہ تخمیناً تین سو برس سے کچھ اوپر ہوگا جب یہ آئین بنا کر جاری کی گئی اور اب تک مروج ہے۔ ناظرین باخبر کو دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ اس رواج میں کوئی کوئی اصول شرع اور کچھ پرانے دور کی بے سروپا دستور کو ملا کر ایک عجیب ڈھنگ کے آئین کو اپنی قوم کے حالات وطبائع کے موافق بنا لیا ہے''۔ (۴۸)

نوٹ: اس میں شک نہیں کہ قارئین حضرات ''حیات افغانی'' کے اقتباسات پڑھتے وقت دقت محسوس کریں گے کیونکہ یہ ۱۵۰ سال قدیم نسخہ ہے لیکن چونکہ یہ کتاب وزیری آئین کیلئے اصل مأخذ ہے اس لیے اس کی عبارت میں الفاظ کی تبدیلی اس مقالے کے اصل روح کو متاثر کرتی ہے۔ اردو دان حضرات اگر کسی قدر توجہ سے اس کے اقتباسات پڑھیں گے تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔

قبائل میں آج تک تحکیم پر مبنی نظام کیوں رائج ہے؟:

جس طرح عہد نبوی سے پہلے قبائلی رواج کے مطابق ثالثی کے ذریعے فیصلے ہوا کرتے تھے، اسی طرح قبائلی علاقوں میں آج بھی تحکیم کی رو سے فیصلے ہوا کرتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہ علاقے آج بھی قانون کی عمل داری میں نہیں آئے ہیں۔ تنازعات کو حل کرنے کے دوران فریقین میں سے عموماً ہر ایک کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ثالثی کے ذریعے من پسند فیصلے کرائے جائیں۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کیلئے ہر جائز و ناجائز طور طریقے استعمال کیے جاتے ہیں اور جو لوگ اسلام کے سچے شیدائی کے طور پر مشہور ہیں، باہمی تنازعات اور دنیاوی معاملات کے دوران ان کا رویہ اور ناجائز دعوے دعاوی دیکھ کر انسان دنگ رہ جاتا ہے۔ موجودہ دور میں قبائل کے اندر قتل و غارتگری اور مظالم کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ من پسند فیصلوں کے حصول کی تگ و دو میں معاملہ لڑائی جھگڑے پر منتج ہوتا ہے کیونکہ کوئی قوت نافذہ موجود ہی نہیں جو فیصلے کا نفاذ قوت قاہرہ کے ذریعے کر سکے۔ البتہ دینی مدارس کے قیام، علماء کی کثرت، ان کی وعظ و نصیحت اور تبلیغی جماعت کی دن رات کی کوششوں سے حالات بہت حد تک سدھر گئے ہیں۔ جو لوگ ترغیب و ترہیب اور وعظ و نصیحت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، عصر حاضر میں مظلوم کی شکایت پر بعض عناصر کی ایک تنبیہ سے ان کا رویہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔ ان عوامل کی وجہ سے آج کل اکثر فیصلے شرعی قانون کے مطابق ہونے لگے ہیں۔

اس تمام پس منظر سے ایک بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اگر کوئی حق بات کہتا ہے اور اس کے پاس کچھ نہ کچھ طاقت بھی ہو تو قبائل حکم ماننے کیلئے تیار ہوتے ہیں۔ شریعت اسلامی کے حامی افراد قبائل کے اسی رجحان کو یہاں حالات سدھارنے کیلئے بطور استدلال پیش کرتے ہیں کہ اگر رسم و رواج پر مبنی اس معاشرے میں سو فیصد شریعت نافذ کی جاتی ہے جو ان کے سسٹم اور قبائلی روایات کے ساتھ کم و بیش ساٹھ فیصد تک ہم آہنگ ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ یہاں ایک ایسے قانون کی عمل داری قائم کی جاسکتی ہے جس کی مزاحمت کی جرأت قبائل دینی حمیت، معاشرتی روایات اور سماجی اقدار کی وجہ سے نہیں کر سکتے اور اس طرح لا قانونیت پر مبنی اس معاشرے میں حکومتی نظم و نسق قائم ہونے کی تمام رکاوٹیں ختم کی جاسکتی ہیں۔ اس سے امن و آمان کی صورت حال بہتر ہوگی، بند و بستی علاقوں سے اغواء برائے تاوان کا سلسلہ ختم ہوگا، معاشی سرگرمیاں شروع ہونے کی وجہ سے نوجوان نسل کیلئے روزگار کے مواقع پیدا ہونگے۔ اور آج فاٹا جن مسائل کا سبب بنا ہوا

ہے، ان کا مثبت اور پر امن طریقے سے سد باب ہو سکے گا۔ ہاں ایک بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ سوات اور مالاکنڈ میں حال ہی میں نظام عدل ریگولیشن کے نفاذ کے دوران فریقین کی طرف سے جس افراط وتفریط کا مظاہرہ کیا گیا، فاٹا میں اس کا اعادہ نہ ہونے پائے بلکہ اخلاص کے ساتھ حقائق کا سامنا کرتے ہوئے مثبت تبدیلی اور اصلاح کی راہ تلاش کی جائے۔

غرض یہ کہ آج پوری قبائلی پٹی بالعموم اور وزیرستان بالخصوص کسی منظّم قانون کے وجود سے محروم ہے اور پوری دنیا کا میڈیا اس بات پر متفق ہے کہ کسی منظّم قانون کے فقدان ہی کی وجہ سے یہ علاقہ پاکستان کیلئے ماضی میں بھی مسائل کا سبب بنا رہا ہے اور دور حاضر میں تو یہ پوری دنیا کے عدم استحکام کا ذمہ دار گردانا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وزیرستان کی حد تک باہمی اور اندرونی مسائل تحکیم پر مبنی وزیری رواج یا وزیری آئین کے ذریعے حل ہوتے ہیں لیکن کیا اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ پوری قبائلی پٹی میں مکمل قانونی نظام رائج ہو؟ واضح بات ہے کہ جواب اثبات میں ہے اور اس کا سب سے آسان طریقہ یہ ہے کہ یہاں تحکیم پر مبنی نظام کا عمیق مطالعہ کیا جائے، یہاں کے بود و باش کے طور طریقوں کو دیکھا جائے اور پھر کسی قانونی نظام کے نفاذ کا فیصلہ کیا جائے۔ ظاہر بات ہے کہ وزیرستان بلکہ پورے قبائلی علاقے میں اکثریت کا رجحان اسلامی نظام کی طرف ہے اور وہ اس سے کافی حد تک مانوس بھی ہیں کیونکہ تحکیم کی صورت میں اسلامی طرز معاشرت کے بہت سے خط و خال یہاں پہلے سے موجود ہیں۔ ماضی اور حال میں اکثریت کی طرف سے اسلامی نظام کے نفاذ کے مطالبات بھی ہوتے رہے ہیں۔ اس لیے شرعی نظام کے نفاذ سے ''ہم ثواب و ہم خرما'' کے مصداق ایک تو یہ علاقہ قانون کی حکمرانی تلے آئے گا، مزاحمت بھی نہیں ہوگی اور لاقانونیت کے جن مفاسد سے یہ علاقہ سسک رہا ہے اس کا خاتمہ بھی ہوگا۔

حوالہ جات

۱۔ عارف مسعود۔وزیرستان کرم سے گومل تک۔ص۴

۲۔ عارف مسعود۔وزیرستان کرم سے گومل تک۔ص ۷

۳۔ محمد نواز محسود، ڈاکٹر۔فرنگی راج اور غیرت مند مسلمان۔ص ا۔وحید آرٹ پریس ڈیرہ اسماعیل خان۔سال اشاعت ۲۰۰۰ء

۴۔ محمد نواز محسود، ڈاکٹر۔فرنگی راج اور غیرت مند مسلمان۔ص ا۔

۵۔ محمد نواز محسود، ڈاکٹر۔فرنگی راج اور غیرت مند مسلمان۔ص ا۔

۶۔ عارف مسعود، وزیرستان کرم سے گومل تک۔ص ۹

۷۔ ابن منظور۔لسان العرب۔ج ۳۔ص ۲۷۰۔دارالاحیاء التراث العربی، بیروت لبنان

۸۔ مسعد عواد حمدان۔التحکیم فی الشریعۃ الاسلامیۃ والنظم الوضعیۃ۔ص ۴۱۔مکتبہ دارالایمان المدینۃ المنورۃ

۹۔ ابن منظور۔لسان العرب۔ج ۵۔ص ۲۱۵

۱۰۔ رابعہ۔رابعہ جدید اردو لغت۔ص ۴۳۳۔رابعہ بک ہاؤس، الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

۱۱۔ فیروز الدین، مولوی۔فیروز اللغات عربی اردو۔ص ۲۳۶۔فیروز سنز لمیٹڈ۔اشاعت دوم ۱۹۷۵ء

۱۲۔ ابن منظور۔لسان العرب۔ج ۵۔ص ۳۳۵۔دارالاحیاء التراث العربی۔بیروت لبنان

۱۳۔ رابعہ۔رابعہ جدید اردو لغت۔ص ۴۴۱

۱۴۔ فیروز الدین، مولوی۔فیروز اللغات عربی اردو۔ص ۴۴۰

۱۵۔ فیروز الدین، مولوی۔فیروز اللغات عربی اردو۔ص ۴۴۰

۱۶۔ ابن منظور۔لسان العرب۔ج ۹۔ص ۱۵۳ تا ۱۵۵

۱۷۔ ابن عابدین، محمد امین افندی۔نشر العرف۔ج ۲۔ص ۱۱۴۔مکتبہ قاسمیہ کانسی روڈ کوئٹہ۔ت ن

۱۸۔ ابوزہرہ۔اصول الفقہ۔ص ۲۷۳۔ادارۃ المعارف القاہرہ مصر

۱۹۔ محمد فاروق النبہان۔نظام الحکم فی الاسلام۔ص ۳۹۴۔دارالاحیاء التراث العربی، بیروت لبنان

۲۰۔ خلاف، عبدالوہاب۔مصادر التشریع الاسلامی فیما لا نص فیہ۔ص ۱۴۵۔ادارۃ المعارف القاہرہ مصر

۲۱۔ حسین حامد حسّان، ڈاکٹر۔ المدخل لدراسۃ الفقہ الاسلامی۔ص۲۱۳۔ادارۃ المعارف القاہرہ مصر

۲۲۔ فیروز الدین، مولوی۔ فیروز اللغات عربی اردو۔ص ۴۷۸

۲۳۔ خلاّف، عبد الوہاب۔ مصادر التشریع الاسلامی فیما لانص فیہ۔ص ۱۴۵

۲۴۔ ابن منظور۔لسان العرب۔ج ۹۔ص ۴۶۱

۲۵۔ ابن نجیم۔الاشباہ والنظائر۔ص ۹۳۔ایچ ایم سعید کمپنی ادب منزل کراچی

۲۶۔ ابن عابدین، محمد امین افندی۔نشر العرف۔ج ۲۔ص ۱۱۴

۲۷۔ صدیقی، ساجد الرحمان۔عرف وعادت اسلامی قانون کی نظر میں۔اسلامک پبلیکشنز، پرائیویٹ لمیٹڈ لاہور۔اشاعت اول ۱۹۹۱ء۔

۲۸۔ ابن عابدین، محمد امین افندی۔نشر العرف۔ج ۲۔ص ۱۱۴

۲۹۔ خلاّف، عبد الوہاب۔ مصادر التشریع الاسلامی فیما لانص فیہ۔ص ۱۴۵

۳۰۔ مسعد عواد حمدان۔التحکیم فی الشریعۃ الاسلامیۃ والنظم الوضعیۃ۔ص ۴۱۔مکتبہ دار الایمان المدینۃ المنورۃ

۳۱۔ صبحی محمصانی، ڈاکٹر۔فلسفہ شریعت اسلام، اردو ترجمہ مولوی محمد احمد رضوی۔مجلس ترقی ادب لاہور۔طبع ششم ۱۹۸۱ء۔

۳۲۔ محمد حیات خان۔حیات افغانی۔ص ۴۲۴۔گلوب پبلشرز اردو بازار لاہور۔ت ن

۳۳۔ صدیقی، ساجد الرحمان۔اسلامی معاشرہ کی تاسیس وتشکیل۔ص ۴۲

۳۴۔ امینی، محمد تقی، مولانا۔فقہ اسلامی کا تاریخی پس منظر۔ص ۸۸۔قدیمی کتب خانہ آرام باغ کراچی

۳۵۔ مسعد عواد حمدان۔التحکیم فی الشریعۃ الاسلامیۃ والنظم الوضعیۃ۔ص ۲۰

۳۶۔ مسعد عواد حمدان۔التحکیم فی الشریعۃ الاسلامیۃ والنظم الوضعیۃ۔ص ۲۰

۳۷۔ شہناز، نور احمد، ڈاکٹر۔تاریخ نفاذ حدود۔ص ۱۱۰۔فضلی سنز پرائیویٹ لمیٹڈ۔اشاعت اول ۱۹۹۸ء

۳۸۔ العجلانی، منیر۔عبقریۃ الاسلام فی عہد الحکم۔ص ۳۳۷۔دمشق، جامعہ دمشق۔ت ن

۳۹۔ شہناز، نور احمد، ڈاکٹر۔تاریخ نفاذ حدود۔ص ۱۱۰۔

۴۰۔ مسعد عواد حمدان۔التحکیم فی الشریعۃ الاسلامیۃ والنظم الوضعیۃ۔ص ۲۵۔مکتبہ دار الایمان المدینۃ المنورۃ

۴۱۔　قرآن، البقرۃ، ۱۸۵
۴۲۔　مسعد عواد حمدان۔ التحکیم فی الشریعۃ الاسلامیۃ والنظم الوضعیۃ۔ ص ۲۳
۴۳۔　قرآن، النساء، ۳۵
۴۴۔　قرآن، الحجرات، ۹
۴۵۔　مسعد عواد، حمدان۔ التحکیم فی الشریعۃ الاسلامیۃ والنظم الوضعیۃ۔ ص ۴۰ تا ۴۳
۴۶۔　قرآن، البقرۃ، ۱۸۵
۴۷۔　مسعد عواد، حمدان۔ التحکیم فی الشریعۃ الاسلامیۃ والنظم الوضعیۃ۔ ص ۴۰ تا ۴۳
۴۸۔　محمد حیات خان۔ حیات افغانی۔ ص ۴۲۴۔ گلوب پبلشرز اردو بازار لاہور۔ ت ن